قانون سازی کے قرآنی اصول

ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

انسانی تمدن کی بقا اور ترقی کا دارومدار قیام عدل پر ہے' اور قیام عدل کے لیے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن کو روبعمل لا کر معاشرے سے ظلم و تعدی کا خاتمہ کیا جا سکے۔ ہر فرد کے نہ صرف حقوق و فرائض متعین ہوں بلکہ ہر ایک بلامطالبہ اپنے حقوق حاصل کر سکے اور بہرطور اپنے فرائض کی بجاآوری کا پابند ہو۔

قانون سازی کا آغاز کیسے ہوا؟ مختلف علمائے عمرانیات نے نظریہ معاہدہ عمرانی کی مختلف تعبیرات کی ہیں۔ نظریہ معاہدہ عمرانی کی کسی بھی تعبیر کو درست مانا جائے' ہر صورت میں یہ نتیجہ بدیہی ہے کہ بااختیار قوت حاکمہ کے بغیر' جو ظلم اور ناانصافی کی راہیں بند کر کے عدل قائم کر سکے' روئے زمین پر بنی نوع انسان کی بقا اور ارتقا ناممکن ہے۔ مسلم مفکرین کا نقطہ نظریہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اچھے کام کرے اور بدی کے کاموں سے پرہیز کرے۔ سادہ زندگی میں نیکی اور بدی کا امتیاز شاید آسان ہو لیکن متمدن زندگی کے پیچیدہ مسائل میں یہ امتیاز ہرگز آسان نہیں۔ عملی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار انسانی ہاتھوں میں ہو' خواہ یہ حق فرد کو دیا جائے یا اجتماع کو' لیکن اس میں چند مشکلات حائل ہوتی ہیں:

۱۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں غیر جانب دارانہ رویے کا التزام تقریباً ناممکن ہے۔ قانون ساز ادارے کے افراد اپنے ذاتی یا اپنے طبقے کے مفادات کو ترجیح دے دیتے ہیں جس سے ناانصافی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایسا قانون صرف کوئی غیر جانب دار شخصیت ہی بنا سکتی ہے جو تمام افراد معاشرہ اور تمام طبقات کے ساتھ مساویانہ رویہ رکھے۔

۲۔ قانون مستقبل کے لیے بنایا جاتا ہے' اس لیے قانون سازی کے لیے جہاں ماضی کے تجربات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہاں مستقبل بینی کی صلاحیت ہونا بھی ضروری ہے۔ انسانوں میں چونکہ مستقبل بینی کی صلاحیت محدود ہے اس لیے ان کے بنائے ہوئے قوانین بشری کمزوریوں کے آئینہ دار اور تغیر و تبدل کا شکار رہتے ہیں۔

۳۔ محض عقل کو نیکی اور بدی کا معیار مان لینے سے پیچیدہ مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ امرِ واقعہ

یہ ہے کہ ایک ہی مسئلے میں مختلف افراد میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے۔ بعض پیچیدہ معاملات میں انتہائی خلوص، دیانت داری اور عقل و دانش کے استعمال کے باوجود یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ اس میں نفع کا پہلو راجح ہے یا نقصان کا۔ اس نوعیت کا عقلی و استدلالی اختلاف رائے قانون سازی میں رکاوٹ بنتا ہے۔

۴۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو قانونی حیثیت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب انھیں کسی بااختیار حاکم یا ادارے کی منظوری حاصل ہو یا کوئی بااختیار عدالت انھیں قانون کا درجہ دے کر نافذ کر دے۔ اگر ایسی کوئی چیز ان قوانین کو حاصل نہ ہو تو ان کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

بنی نوع انسان پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسانی غلطیوں کے امکانات کو کم کرنے، انسان کی محدود صلاحیتوں کا دائرہ وسیع کرنے اور انسانی دانش کو جلا بخشنے کے لیے عقلی ہدایت کے ساتھ الہامی ہدایت کا اہتمام بھی فرمایا۔ ایسے برگزیدہ افراد کو ہادی بنا کر بھیجا جو حقیقی حاکم کے احکام انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ انھی مقدس ہستیوں میں آخری شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جن کے ذریعے سے دین کی تکمیل ہو گئی اور نیکی اور بدی میں واضح خط امتیاز کھینچ دیا گیا اور بنی نوع انسان کے لیے ہدایت و شفا کی آخری کتاب نازل کی گئی جس کی تعبیر، تفسیر اور توضیح و بیان کا کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے کیا۔

دین کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ کتاب الٰہی نے وہ تمام ضوابط، اصول اور کلیات بتا دیے جو قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ الہامی ہدایت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قیامت تک کے غیر محدود جزئی واقعات میں براہ راست رہنمائی کرے، رہنمائی کے دوسرے ذریعے یعنی عقل و دانش کو عملاً مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔

قرآن اور حدیث نے اصول و کلیات کے ساتھ کئی ایک معاملات میں جزوی قانون سازی بھی کی اور کئی substantive laws بھی دیے جو صدر اول کے ساتھ تمدن کی ضروریات کے لیے کافی تھے لیکن تمدن کے ارتقا کے ساتھ انسانی ضروریات اور مسائل میں اضافہ ہوتا گیا اور ایسی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں جن کے بارے میں کتاب و سنت میں واضح ہدایات موجود نہیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وحی کا دروازہ تو بند ہو گیا لیکن امت مسلمہ کسی قانونی بحران سے دوچار نہیں ہوئی۔ قرآن و حدیث میں واضح طور پر اس امر کی ہدایات موجود تھیں کہ اہل علم کو قانون الٰہی کے علل و حکم کا ادراک حاصل کر کے استنباط و استخراج کے ذریعے قانون سازی کرنی چاہیے۔ چنانچہ مسلم فقہا نے بہت قلیل مدت میں ایک مکمل قانونی نظام تشکیل دے دیا۔ اس قانونی نظام کو عوام و خواص میں اعتبار حاصل تھا۔ نیز اس میں وہ لچک اور ارتقا کی صلاحیت پیدا ہو گئی جس نے اسے زمان و مکان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا دیا۔

خدائی قانون اور انسانی قانون

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں: ثبات اور تغیر۔ زندگی کے بہت سے امور و مسائل ایسے ہیں جن میں تاریخی، جغرافیائی، معاشی اور عمرانی عوامل کسی قسم کی تبدیلی نہیں لاتے بلکہ وہ امور ہمیشہ ایک ہی طرح رہتے ہیں۔ مثلاً بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق یا نسل انسانی کی بقا سے متعلق امور ایسے معاملات ہیں جو تمدن کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے زندگی کے ثباتی پہلو سے متعلق ایسے قوانین ہونے چاہییں جو تغیر پذیر نہ ہوں بلکہ دائمی اور ابدی ہوں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسانی تمدن کے ارتقا سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں مثلاً حصول معاش کے ذرائع میں تنوع، نظام حکومت کیسا ہونا چاہیے، کسی ملک کے دستور کی ساخت کیسی ہو، عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے باہمی روابط کی نوعیت کیا ہو اور قومی یا بین الاقوامی تعلقات کی تفصیلات کیا کیا ہونی چاہییں۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جن میں تغیر و ارتقا ناگزیر ہے۔

قرآن حکیم نے جو قوانین دیے ہیں ان میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایسے امور جن میں تبدیلی رونما نہیں ہوتی، ان کے لیے مفصل اور غیر مبدل قوانین دیے گئے ہیں۔ اور جن معاملات میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے ان میں اصولی ہدایات اور قواعد کلیہ دینے کے بعد تفصیلی قانون سازی علما و مجتہدین کے سپرد کی گئی ہے (النسا ۴:۸۳)، تاکہ تمدن کے ارتقا کے ساتھ قانون میں ارتقا کا عمل جاری رہے۔ گویا اسلامی ادبیات میں قانون کی دو قسمیں ہیں: ایک الہامی قانون جس میں ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کا کسی فرد بشر کو اختیار نہیں اور دوسرا الہامی قانون سے مستنبط قانون جس کی تخریج و استنباط میں انسانی کاوشیں کارفرما رہی ہیں۔ مستنبط قانون میں انسانی عمل دخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف اس میں غلطی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے جو اس کے بارے میں مزید بحث و تحقیق کا دروازہ کھولتا ہے تو دوسری طرف وہ ایک متعین زمانے، مخصوص تمدن اور خاص حالات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے قابل تغیر اور تمدن کے پہلو بہ پہلو ارتقا پذیر رہتا ہے۔ اسلامی قانون کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے جو اسے کسی دور اور کسی ماحول میں ازکار رفتہ اور سماجی حالات سے الگ نہیں ہونے دیتی بلکہ ہر دور میں اسے زندہ، تازہ اور موجود چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد رکھتی ہے۔

اسلامی قانون کی یہی خوبی ہے جس نے اسلام کو دائمی اور عالمگیر حیثیت عطا کی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع ہے نہ ضرورت، البتہ تھوڑی سی مزید وضاحت سے تغیر پذیر اور ناقابل تغیر امور میں قرآن کی قانون سازی کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آسکتا ہے۔

قرآن حکیم میں تقریباً پانچ سو آیات کا تعلق فقہ و قانون سے ہے جن میں سے نصف سے زائد آیات صرف عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) سے متعلق ہیں۔ چونکہ عبادات تمدنی ارتقا سے متاثر نہیں ہوتیں یا

انھیں متاثر نہیں ہونا چاہیے، اس لیے ان کے بارے میں مستقل، دائمی اور تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ اس کے بعد احوال شخصیہ personal laws سے متعلق قوانین ایسے ہیں کہ ان میں تبدیلی کی گنجایش بہت کم ہوتی ہے، اس لیے نکاح، طلاق، عدت، نسب، رضاعت، ولایت، وصیت اور وراثت وغیرہ کے بارے میں قرآن حکیم میں تقریباً ستر آیات ہیں۔ معاشرتی اور مالی قوانین (civil laws) جو باہمی اشترک عمل کے لیے مقرر ہیں مثلاً خرید و فروخت، اجارہ، رہن، کفالہ، عاریتہ، امانت اور ضمانت وغیرہ احکام کے بارے میں بھی تقریباً ستر آیات ہیں۔ معاشرتی اور مالی قوانین (civil laws) جو باہمی اشتراک عمل کے لیے مقرر ہیں، مثلاً خرید و فروخت، اجارہ، رہن، کفالہ، عاریتہ، امانت اور ضمانت وغیرہ کے احکام کے بارے میں بھی تقریباً ستر آیات ہیں۔ جرائم اور ان کی سزاؤں مثلاً قتل، چوری، ڈاکہ، قذف اور بدکاری وغیرہ کے احکام کے بارے میں تقریباً تیس آیات ہیں۔ عدالتی طریق کار مثلاً گواہی، قسم، قانون مزافعہ، اصول محاکمہ اور عدل بین الناس سے متعلق تیرہ آیات ہیں۔ دستوری احکام مثلاً نظام حکومت، حکام اور شہریوں کے باہمی حقوق و فرائض (cons-titutional laws) کے بارے میں تقریباً دس آیات ہیں۔ بین الاقوامی قانون سے متعلق جس میں بین الاقوامی تعلقات، معاہدات اور احکام صلح و جنگ شامل ہیں، پچیس آیات ہیں۔ مالی قوانین (fiscal laws) مثلاً محروم معیشت افراد کے حقوق اور زکوٰۃ و صدقات کے مصارف و محاصل، اغنیا اور فقرا نیز حکومت اور شہریوں کے باہمی مالی تعلقات کے بارے میں تقریباً دس آیات ہیں۔

اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ قرآن حکیم نے ثبات و تغیر کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ عبادات، احوال شخصیہ اور میراث وغیرہ کے مسائل ایسے ہیں، جن کے تفصیلی احکام قرآن حکیم میں موجود ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر احکام امور تعبدی (religious observance) ہیں جن میں عقل کی در اندازی کی گنجایش کم ہے اور تمدن کے اختلاف سے ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ جو احکام ہیں ان میں سے بیشتر کے اصول و ضوابط اور قواعد کلیہ قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں اور جزئی تفصیلات سے قرآن نے تعرض نہیں کیا جس کی وجہ یہ ہے کہ ان احکام کا تعلق زیادہ تر، تمدن، معاشرے اور اجتماعی زندگی سے ہے جس میں احوال و کوائف کا اختلاف، وسعت اور گنجایش کا متقاضی تھا چنانچہ قواعد اساسیہ بیان کر کے تفصیلات طے کرنے کی ذمہ داری ان فقہا اور اہل علم پر چھوڑ دی جن کا ان مخصوص حالات سے سابقہ پڑے گا۔

اسلامی قانون کے ماخذ

کسی علم کے ماخذ سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں سے اس کے ضوابط بلاواسطہ اور بنیادی طور پر حاصل کیے جا سکیں۔ جب کسی متعین آیت یا حدیث سے کوئی قانون اخذ کیا جائے تو وہ آیات یا حدیث اس قانون کا ماخذ ہوگی۔ اسی طرح جب کسی مسئلے کا حل کسی قاعدہ کلیہ سے متعین طریقوں کے مطابق مستنبط کیا جائے تو

وہ قاعدہ کلیہ اس حکم کا ماخذ کہلائے گا۔ مسلم علماے قانون نے اسلامی قانون کے تین ماخذ شمار کرائے ہیں: ۱۔ الکتاب (قرآن حکیم)، ۲۔ السنتہ (حدیث)، ۳۔ اجتہاد (اجماع، قیاس)۔

الکتاب

قوانین اسلامی کا راست ماخذ قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ کتاب اللہ اسلامی قوانین کا اولین اور بنیادی ماخذ ہے۔ یہ آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی تاویل اور اختلاف رائے کی گنجایش نہیں ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (النساء ۴:۱۰۵)

ترجمہ: یقیناً ہم نے آپؐ پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھایا ہے۔ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء ۴:۵۹) پس اگر تم میں باہم کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ آیات بھی ملاحظہ کیجیے:

"تو کیا یہ لوگ زمانہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں اور جو قوم یقین رکھتی ہے اس کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے" (المائدہ ۵:۵۰)۔

"آپ لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کیجیے اور لوگوں کی خواہش پر عمل نہ کیجیے" (المائدہ ۵:۴۸)۔

"حکم تو اور کسی کا نہیں بجز اللہ کے، وہی حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے" (الانعام ۶:۵۷)۔

"حکم صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے یہی دین مستقیم ہے" (یوسف ۱۲:۴۰)۔

"اور اس کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا کر نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات کے سوا ہر شے فنا ہونے والی ہے، حکومت صرف اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے" (القصص ۲۸:۸۸)۔

"جس چیز میں بھی تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے" (الشوریٰ ۴۲:۱۰)۔

"ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں، ہم نے سن لیا اور مان لیا" (النور ۲۴:۵۱)۔

بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔

قرآن نے کہیں بھی دستوری دفعات اور قانونی شقوں کی کوئی فہرست نہیں دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم خلا میں نہیں، ایک متحرک معاشرے میں ایک زندہ نبی پر نازل ہوا، اور اس نبی کا اولین فریضہ یہ تھا کہ وہ قرآن کی عملی تفسیر پیش کرے (البقرہ ۲:۱۲۹، الاحزاب ۳۳:۲۱)۔ اس لیے قرآن نے صرف عام ہدایات پر اکتفا کیا اور تفصیلات و توضیحات کی ذمہ داری نبی پر چھوڑ دی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو کتاب قانون نہیں بلکہ کتاب ہدایت (البقرہ ۲:۲، بنی اسرائیل ۱۷:۹) کہتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ضمانت دیتا ہے اور مسلمانوں کو آپؐ کی سنت کے اتباع کا پابند کرتا ہے۔

قانون سازی کے قرآنی اصول

قرآن حکیم نے قانون سازی کی بنیاد اصولوں پر رکھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن نے کسی جگہ ترتیب وار ان اصولوں کو گنوا کر انھیں اساس تشریع قرار دیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے اوامر و نواہی میں غور کرنے اور انسانی مزاج اور طبیعت کو مدنظر رکھ کر مختلف احوال و کوائف کے تغیر و تبدل کا مطالعہ کرنے سے یہ آٹھ اصول تشریع قرآنی میں جاری و ساری نظر آتے ہیں: یہ اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ عدم حرج، ۲۔ قلت تکلیف، ۳۔ تدریج، ۴۔ نسخ، ۵۔ اسباب نزول، ۶۔ اباحت، ۷۔ ازالہ ضرر، ۸۔ معقولیت۔

۱۔ عدم حرج

حرج عربی زبان میں غیر معمولی تنگی کو کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حرج کی تفسیر ضیق (confinement) سے کی ہے لیکن اس لفظ کی پوری وضاحت اس بیان سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا کہ حرج کے کیا معنی ہیں؟ انھوں نے کہا: "کیا تم عربی نہیں ہو جو اس کے معنی پوچھتے ہو"۔ پھر قبیلہ ہذیل کے ایک آدمی کو بلوایا اور اس سے پوچھا: "ما الحرج؟ حرج کے کیا معنی ہیں؟" اس نے جواب دیا: "حرج اس جھاڑی کو کہتے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو" (لسان العرب ۲:۲۳۴)۔

عربی لغت کے ماہر عالم، زجاج (م ۳۱۱ھ / ۹۲۳ء) کہتے ہیں: "حرج کا لفظ غیر معمولی تنگی کے لیے بولا جاتا ہے" (ایضاً)۔

قرآنی اصول تشریع میں عدم حرج سے مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے اوامر و نواہی میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قوانین میں انسانوں کے لیے آسانی اور سہولت کا پہلو ہو، ایسے قوانین نہ ہوں جو انسانی استطاعت سے ماورا اور بشری طاقت سے باہر ہوں۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات سے عدم حرج کے اصول کی تائید ہوتی ہے۔

مثلاً:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (المائدہ ۵:۶)

اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھیں تنگی میں ڈال دے بلکہ وہ تمھیں پاک صاف کرنا چاہتا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۲۲:۷۸) اللہ نے دین کے معاملے میں تمھیں تنگی میں مبتلا نہیں کیا۔

قرآن حکیم نے ایک مقام پر رسول اکرمؐ کے فرائض نبوت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷) جو بوجھ اور بیڑیاں اب تک ان پر تھیں، وہ اتارے دیتا ہے۔

بوجھ اور بیڑیوں سے مراد وہ تمام احکام و اعمال ہیں جن میں دشواری ہو اور معمول سے زیادہ مشقت اٹھانی پڑے۔

قرآن حکیم نے اس بوجھ اور بیڑیوں کا دوسرے مقامات پر ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، توہم پرستی، علما اور فقہا کی تقلید کی بیڑیاں اور مذہبی علما کی خدائی کی زنجیریں تھیں جنھیں رسول اللہؐ نے سہل، آسان اور قابلِ عمل شریعت کے ذریعے ختم کر دیا۔

رسول اکرمؐ کی متعدد احادیث مبارکہ سے بھی عدمِ حرج کے اصول پر استدلال کیا گیا ہے۔ ایسی تمام روایات کا استقصا ممکن ہے نہ مطلوب۔ بطور نمونہ چند روایات درج ذیل ہیں:

آپؐ کا ارشاد ہے: "آسان سچا دین ہی اللہ کو محبوب ہے اور میں آسان سچا دین دے کر بھیجا گیا ہوں" (مسند احمد ۶:۱۱۶)۔

نیز فرمایا: "دین بہت آسان ہے، جو شخص دین میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آ جائے گا لہٰذا سیدھے رہو اور زیادہ بلند پروازی نہ کرو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمھیں آسان دین ملا ہے)" (بخاری، کتاب الایمان)۔

ایک اور موقع پر ایک خوبصورت مثال سے سمجھاتے ہوئے فرمایا: "یہ دین نہایت موزوں اور مضبوط ہے اس کو نرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور زیادہ سختیاں اٹھا اٹھا کر اللہ کی عبادت سے اپنے دل میں نفرت پیدا نہ کرو کیونکہ زیادہ تیز رو مسافر اپنی سواری ہلاک کر دیتا ہے اور منزل طے کرنے سے بھی رہ جاتا ہے" (مسند احمد عن انس بن مالک)۔

آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو بعض دینی اور انتظامی امور سپرد کرتے ہوئے ہدایت فرمائی: "آسانی پیدا کرنا، مشکل میں نہ ڈالنا، لوگوں کو رغبت دلانا، انھیں متنفر نہ کرنا، باہمی تعاون کے

جذبے کو ابھارنا، اختلاف نہ ڈالنا" (بخاری، کتاب المغازی، ۳۶۰)۔

ان آیات و احادیث کا یہ مطلب نہیں کہ احکام خداوندی کی بجاآوری میں کسی قسم کی تنگی اور تکلیف اٹھانی پڑے تو ان احکام میں ترمیم و تنسیخ کر دی جائے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تو انسان کے مکلف ہونے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں حرج کی درجہ بندی کی ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ لکھتے ہیں:

"حرج درحقیقت تنگی کو کہتے ہیں۔ وہ مشقتیں جو عادتاً روزانہ کے کام کاج میں ہوتی ہیں حرج میں داخل نہ ہوں گی، لغوی اعتبار سے نہ شرعی اعتبار سے، ورنہ مطلقاً حرج سے گلوخلاصی تو ممکن ہی نہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں حرج کا ہونا شرعی حکمت میں داخل ہے تاکہ انسان کی آزمایش ممکن ہو۔ اگر کسی حکم پر عمل درآمد کے نتیجے میں اس سے زیادہ اہم بات میں کوتاہی ہوتی ہے مثلاً کوئی کام کرنے سے ترک واجب یا ارتکاب حرام کی نوبت آتی ہے تو اس نوع کے حرج کو ختم کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک اصول دین کی حفاظت کا تعلق ہے تو وہ انسانی جان اور جوارح پر مقدم ہیں" (شاطبی، ۲:۱۰۹، ۱۵۳)۔

۲۔ قلت تکلیف

قلت تکلیف عدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی قوم اور ملت کو تکلیف مالایطاق نہیں دی۔ البتہ امم سابقہ کو گاہے گاہے ایسے امور کا مکلف ضرور کیا جن میں خاصی مشقت اٹھانا پڑتی تھی (الانعام ۶:۱۴۷) امت محمدیہ پر اللہ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ اسے غیر معتاد مشقت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲:۲۸۶) اللہ نے کسی نفس کو اس کی گنجایش سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ اس آیت کی تفسیر میں تمام معروف مفسرین متفق ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی ہی تکلیف دی ہے جتنی برداشت کرنے کی وہ طاقت رکھتا ہے اور اسے آسانی سے برداشت کرلیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امورِ شرعیہ کی ادائیگی میں اسے انتہائی طاقت اور پورا زور لگانا پڑے (طبری، تفسیر کبیر، ابن کثیر وغیرہ بذیل آیت ۲:۲۸۶)

نیز فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲:۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمھارے لیے دشواری نہیں چاہتا۔

اس سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے درج ذیل آیات دیکھیے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء ۴:۲۸)۔

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے (پابندیوں کا بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۶)۔

اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال جیسے تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا: قد فعلت (میں نے کر دیا)۔ (دیکھیے: تفسیر بیضاوی' ابن کثیر بذیل آیت ۲:۲۸۶)۔

قرآن حکیم نے کرید کرید کر باتیں پوچھنے سے منع کیا مبادا کسی شخص کے سوال کے نتیجے میں کوئی مباح چیز حرام کر دی جائے یا کوئی آسانی ختم کر دی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (المائدہ ۵:۱۰۱)۔

اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر ظاہر کی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر پوچھو گے ان کے متعلق جب قرآن اتر رہا ہے تو تمھارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے آسان ترین کو اختیار کیا جب کہ وہ گناہ نہ ہو" (بخاری' کتاب المناقب ۲۳)۔

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے فرائض مقرر کر دیے ہیں انھیں ضائع نہ کرو' حدود کا تعین کر دیا ہے ان سے تجاوز نہ کرو' جو چیزیں حرام کر دی ہیں ان کی پردہ دری نہ کرو' جن چیزوں کے بارے میں بغیر بھولے محض تم پر رحمت کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید نہ کرو (رازی' تفسیر کبیر' ۱۲:۱۰۶)۔

اسی نوع کی بکثرت آیات و احادیث ہیں جن سے شریعت کا یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ احکام و قوانین میں آسانی اور سہولت کو پیش نظر رکھنا چاہیے نہ کہ ایسی مشقت اور تکلیف کو جس سے انسان کا حوصلہ جواب دے جائے۔ چنانچہ سفر کی حالت میں نماز میں قصر اور روزہ چھوڑنے کی اجازت' پانی نہ ملنے یا استعمال نہ کر سکنے کی صورت میں تیمم اور اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کا حلال ہو جانا اسی اصول پر مبنی ہے (الموافقات ۲:۱۳۲)

دنیا میں کوئی بھی کام ایسا نہیں جس کی انجام دہی کے لیے کسی قسم کی تکلیف یا کسی درجے میں بھی مشقت برداشت نہ کرنا پڑے۔ قرآنی تصریحات کے مطابق شریعت کے اوامر و نواہی کا مقصد انسانی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنا اور نفس کو خواہشات کی پیروی سے باز رکھ کر خوب و ناخوب سے روشناس کرانا اور نیک و بد میں فرق کر کے اخذ و ترک کی بصیرت اور عادت پیدا کرنا ہے۔ یہ کام بجائے خود مشقت کا متقاضی ہے۔ اس لیے فقہا نے قلت تکلیف کے اصول کی وضاحت کی ہے تاکہ دین سہل پسند اور آوارہ منش لوگوں کے ہاتھوں میں بازیچہ اطفال نہ بن جائے چنانچہ مشقت یا تکلیف کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ تکلیف معتاد، ۲۔ تکلیف غیر معتاد

تکلیف معتاد سے مراد ایسی محنت ہے جس سے زندگی میں کسی حالت میں مفر نہیں اور انسان کو اتنی طاقت اور ہمت دی گئی ہے کہ وہ محنت کر سکے۔ مشہور مالکی ماہر قانون امام شاطبی لکھتے ہیں:

"جہاں تک نفس مشقت کا تعلق ہے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سے خالی ہو حتیٰ کہ انسان کو کھانے پینے اور زندگی کے دوسرے معمولات پورا کرنے کے لیے بھی مشقت اٹھانا پڑتی ہے لیکن یہ اس طرح کی مشقت ہے کہ جسے انجام نہ دینے والے کو لوگ سست اور کاہل کہتے ہیں۔ پس یہ مشقت انسان کی عادت میں داخل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ شرعی احکام و قوانین کی پابندی میں اس نوع کی مشقت بھی نہ پائی جائے" (الموافقات ۲:۱۲۳)۔

تکلیف غیر معتاد سے مراد ایسی مشقت ہے جو عادت میں داخل نہیں یا اس کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ انسان کے لیے مہلک یا مضر ثابت ہوتی ہے۔ ایسی مشقت کو احکام شرعیہ میں تخفیف اور سہولت سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تکلیف غیر معتاد کے بارے میں شاطبی لکھتے ہیں: "اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ اس پر دائمی عمل سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہو یا کام کرنے والے کی حالت میں مضر تغیر واقع ہوتا ہو جس سے اسے لازمی طور پر کام چھوڑنے یا اس میں تخفیف کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو اس قسم کی مشقت و تکلیف غیر معتاد ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں شریعت نے تخفیف و سہولت کی راہیں نکالی ہیں" (الموافقات ۲:۱۰۷-۱۶۷)۔

۳۔ تدریج

قرآن حکیم کا تیسرا اصول، تشریع تدریج ہے۔ قرآن حکیم پورے کا پورا یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ تقریباً تیئس سال کی مدت میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ جس قسم کی ضرورت درپیش ہوئی اور جس نوعیت کے حالات سے سابقہ پڑا اس کی مناسبت سے احکام نازل ہوتے رہے۔ اس طریق نزول میں بہت سی حکمتیں تھیں جن میں سے کئی ایک کا قرآن (الفرقان ۲۵:۳۲) نے خود ذکر کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی

روایت اس ضمن میں غور طلب ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ تدریجی نزول میں ایک طرف حالات و زمانے کی رعایت ملحوظ رکھنا مقصود تھی اور دوسری طرف زندگی اور قانون میں باہمی ربط پیدا کرنا۔ وہ فرماتی ہیں:

"پہلے پہل قرآن میں مفصّل (سورۃ الحجرات۔والناس) کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے (گویا ترغیب و ترہیب کے ذریعے پہلے لوگوں کا شعور بیدار کرنا مقصود تھا) پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر پہلے دن ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہہ اٹھتے، ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر ابتدا میں ہی زنا سے باز رہنے کا حکم نازل ہوتا تو لوگ کہتے ہم اس سے باز نہیں آسکتے" (بخاری، فضائل القرآن)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے معاشرے کی تربیت کا طریق کار اختیار کیا اور اس میں تدریج کو پیش نظر رکھا۔ مکہ مکرمہ میں قرآن حکیم کا جو حصہ نازل ہوا اس میں مختلف امور اور معاملات کے اصول موجود ہیں۔ ان کی تفصیلات نہیں ہیں مثلاً عائلی زندگی کی اساسیات کا ذکر مکی دور کی آیات میں موجود ہے لیکن ان پر متفرع ہونے والے احکام نکاح، طلاق، عدت، حقوق زوجین، ہبہ، وراثت اور وصیت وغیرہ کی تفصیلات مدینہ میں نازل ہوئیں۔

حرمت زنا سے متعلق آیات مکہ میں نازل ہوئیں لیکن اس پر جاری ہونے والی حدود اور اس سے متعلق دیگر مسائل مدنی دور میں نازل ہوئے۔ قتل نفس کی حرمت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کے بارے میں تفصیلات مدنی زندگی میں آئیں۔

تشریع میں تدریج کی سب سے واضح مثال حرمت خمر ہے۔ اس سے متعلق سب سے پہلی آیت (النحل ۱۶:۶۷) مکہ میں نازل ہوئی جس میں کھجور اور انگور سے حاصل ہونے والی شراب کو رزق حسن کے بالمقابل ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ شراب رزق حسن نہیں بلکہ خبیث شے ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت (البقرہ ۲:۲۱۹) میں تحریم خمر کی طرف مزید پیش قدمی کی گئی، پھر تیسری آیت (النساء ۴:۴۳) میں جزوی طور پر شراب کو ممنوع قرار دیا گیا اور آخر میں (المائدہ ۵:۹۰) میں اسے رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ قرار دے کر تاکیداً یہ بتایا کہ شراب صرف حرام ہی نہیں بلکہ ناپاک بھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو انھیں ہدایات دیں۔ ان میں تدریج کو ملحوظ رکھنے کی رہنمائی ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو، وہاں پہنچو تو انھیں شہادت توحید و رسالت کی طرف بلانا۔ جب وہ یہ مان لیں تو انھیں بتانا کہ ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ جب اس میں تمھاری اطاعت کر لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے

جو ان کے اغنیا سے لے کر ان کے فقرا کو دیا جائے گا" (بخاری، الزکوٰۃ، ۱۴۲۵)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۹۹ھ/۷۱۷ء میں عنان حکومت سنبھالی تو ابھی عہد فاروقی کو گزرے ایک صدی بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ بنو امیہ کے حکمرانوں کی پیدا کردہ خرابیوں کے باوجود عام مسلمانوں کا معیار اخلاق آج کے دور سے کہیں زیادہ بلند تھا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی عدل کے تقاضوں کی تکمیل میں تدریجی طریق کار اختیار کرنا ضروری سمجھا۔ اقتدار ملنے کے بعد ان کے بیٹے عبدالملک نے ان سے کہا: "ابا جان! آپ نے بہت سے ایسے کاموں کو موخر کر دیا ہے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اگر آپ گھڑی بھر کے لیے بھی حکمران ہو گئے تو پہلے ان کاموں کو کر گزریں گے۔ میں تو چاہتا تھا کہ جو عدل و انصاف آپ نافذ کرنا چاہتے ہیں، اسے بے دریغ کر دیں، چاہے نتائج کچھ بھی ہوں"۔ آپ نے جواب دیا: "بیٹے! تیری بعض رائیں ہنوز بچگانہ ہیں۔ میں ان کی اس طرح تربیت کرتا ہوں جیسے سرکش اونٹ کو سدھایا جاتا ہے۔ میں انھیں دین کی جس راہ پر لانا چاہتا ہوں اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے دنیا کا بھی کچھ فائدہ ہو تاکہ اگر دین کی وجہ سے بدکیں تو دنیوی فائدے کے لیے نرم ہو جائیں اور مجھے ایسی مخالفت سے سابقہ نہ پڑے جس کا مقابلہ کرنا میرے لیے ممکن نہ ہو" (ابن الجوزی ۷۱، ابن عبدالحکم ۵۹)۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے اس انداز تشریع سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے کہ قانون کے اجرا میں تدریجی طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔ ابتدائی مرحلے میں قوانین کم ہونے چاہییں اور زیادہ زور تعلیم و تربیت پر دینا چاہیے تاکہ انسان کے اندر سے قانون کی پابندی کا جذبہ پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ قوانین اوپر سے نہ مسلط کیے جائیں پھر جوں جوں فضا تیار ہوتی جائے زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین کا نفاذ کر دیا جائے۔

تدریج کے اصول کو نافذ کرتے ہوئے یہ احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسے معاملات جن میں قانون کے نفاذ کے لیے پیشگی تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ یکبارگی قانون نافذ کیا جا سکتا ہے وہاں بلاوجہ تدریجی طریق کار اختیار کر کے مثبت نتائج کے حصول میں تاخیر نہ کی جائے۔ نیز تدریجی عمل کا مسلسل مطالعہ اور جانچ پرکھ ضروری ہے تاکہ تدریج کا سلسلہ لامتناہی نہ ہو جائے بلکہ بروقت فیصلہ کیا جا سکے۔ جب بھی یہ محسوس ہو کہ اب تربیت کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا ہے اور حالات دوسرے مرحلے کے لیے سازگار ہیں تو اسے بلا تاخیر نافذ کر دیا جائے۔ بہرحال تدریج کو تربیت کا ذریعہ بننا چاہیے، نفاذ قوانین سے فرار کا نہیں۔

۴- نسخ

نسخ کے اصطلاحی معنی ہیں "کسی شرعی دلیل کی بنا پر کسی دینی حکم کا بالکل اٹھ جانا اور ختم ہو جانا"۔ قرآن حکیم میں نسخ کے وجود کے بارے میں علما کے دو گروہ ہیں: علما کی اکثریت امکان نسخ کی قائل ہے جب

کہ ابو مسلم اصفہانی (م ۳۲۲ھ / ۹۳۴م) اور ان کے پیروکار قرآن حکیم میں نسخ کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ دور حاضر کے علما کی ایک جماعت بھی قرآن میں امکان نسخ کی قائل نہیں ہے۔ منکرین نسخ کی دلیل یہ ہے کہ اگر نسخ فی القرآن کو تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اللہ کو بعد میں کوئی بات سوجھی تو اس نے پہلے حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم نازل کر دیا' لیکن یہ دلیل چنداں وقیع نہیں ہے۔ کیوں کہ جس قوم اور جن افراد کے لیے احکام نازل ہوتے ہیں ان کے حالات تغیرپذیر ہوتے ہیں اس لیے حالات کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی آتی ہے۔ سابقہ شریعتوں کے نسخ سے وجود نسخ پر استدلال کیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن میں نسخ کا امکان ثابت ہوتا ہے۔ وقوع نسخ صرف روایت سے ثابت ہو سکتا ہے' درایت سے نہیں۔ اس لیے اس کے ثبوت کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ قرآن حکیم میں اس مضمون کی کوئی آیت موجود ہو کہ فلاں حکم جو پہلے تھا' اب منسوخ کر دیا گیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "میں نے تمھیں قبروں پر جانے سے روک دیا تھا' اب تم جا سکتے ہو"۔ (مسلم' الجنائز ۱۰۶)۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے۔

بعض آیات جن میں نسخ کا شبہ ہوتا ہے ان میں قرآن حکیم نے نسخ کے بجائے تخفیف اور سہولت کا لفظ استعمال کیا ہے (تفصیل کے لیے: الانفال ۸: ۶۵-۶۶ نیز المزمل ۷۳:۲۰)

گویا ان صورتوں میں قرآن نے حالات کی رعایت کی ہے' مطلقاً حکم منسوخ نہیں کیا' بلکہ کسی قدر نرمی پیدا کر دی گئی ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم موجود ہو کہ فلاں آیت اب منسوخ کر دی جاتی ہے۔ ایسا بھی کوئی حکم نہیں ہے۔

۳۔ بعض آیات کے احکام باہم متعارض ہوں اور ان میں توفیق (reconciliation) ممکن نہ ہو۔ نسخ فی القرآن کی بحث اسی تیسری صورت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔

آیات میں تعارض کی صورت میں ہمیشہ نسخ ہی کا قول نہیں کیا جاتا بلکہ تعارض رفع کرنے کے اور حل بھی ہیں مثلاً جہاں قرآن کی کسی آیت سے دوسری آیت کا حکم جزوی طور پر متاثر ہوا ہو' اسے تنسیخ کے بجائے تخصیص' تقیید یا استثنا کہتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی اور مفتی محمد عبدہ سمیت کئی ایک اہل علم کی رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم میں امکان نسخ کے باوجود ایسا کوئی تعارض موجود نہیں ہے جس میں تطبیق' توجیہ یا توفیق ممکن نہ ہو۔

اگر ہم مسئلہ نسخ کو درایت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ بات بے معنی سی ہے کہ کوئی حکم موجود ہو اور اس کے بارے میں آیت اٹھالی گئی ہو یا آیت موجود ہو اور اس کا کوئی عملی فائدہ نہ ہو۔ اور اس کے حکم پر

کسی حالت میں عمل کرنے کی صورت نہ ہو' اس لیے جدید دور کے مفسرین نسخ کو تشریع کے تدریجی اور ارتقائی عمل کے مراحل کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

اس بحث سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ نسخ کا اصول اپنی اہمیت کے باوجود قرآن کے اصول تشریع کا جزو نہیں بن سکتا بلکہ حالات کے تغیر' نئے پیش آمدہ مسائل کی گوناگونی اور مسائل کے نئے گوشوں کے سامنے آنے کے باعث اس نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا تعارض نہیں جس کے لیے نسخ کا قول کرنا پڑے۔ ارشاد ربانی: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء ۴: ۸۲) کیا وہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

۵۔ اسباب نزول

قرآن حکیم تقریباً تئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ اس میں مختلف واقعات پر تبصرے' مشکلات کے حل میں رہنمائی' سوالات کے جوابات اور اسی نوعیت کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو تاریخی پس منظر رکھتی ہیں۔ درحقیقت وحی انسان کی کسی ذہنی کجی' فکری گمراہی یا عملی خرابی کی نشان دہی کرتی ہے اور جس واقعہ پر تبصرہ ہو رہا ہوتا ہے وہ انسان کی اسی کجی اور کمزوری کا ایک مظہر ہوتا ہے (الفوز الکبیر' باب ۲)

بعض مفسرین نے شاید یہ سمجھ لیا کہ قرآن حکیم کی تقریباً ہر آیت کسی واقعہ اور سبب پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی ہر آیت سبب نزول سے وابستہ نہیں۔ سبب نزول کے نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو تین قسم کی آیات سامنے آتی ہیں۔

۱۔ بعض آیات ایسی ہیں کہ سبب نزول جانے بغیر ان کو سمجھنا ممکن نہیں۔ آیت کے الفاظ بار بار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی تاریخی پس منظر ہے مثلاً وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال ۸: ۷) جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تمھیں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

آیت یہ بتاتی ہے کہ کہیں کوئی دو گروہ تھے' ان کے بارے میں کوئی وعدہ تھا' جس کی تفصیل قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اسی طرح اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى (الانفال ۸: ۴۲) جب تم قریب کے ٹیلے پر تھے اور وہ دور کے ٹیلے پر۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ آیت کسی تاریخی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۲۔ کچھ آیات ایسی ہیں کہ ان کا تاریخی پس منظر ہوتا ہے اور اگر وہ پس منظر معلوم ہو جائے تو آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے لیکن اگر پس منظر نہ معلوم ہو تو بھی آیت کا اجمالی مفہوم اور قرآنی حکم کی روح سمجھ آ جاتی ہے۔ مثلاً وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (الانعام ۶: ۱۳۶) اور انھوں نے بنا رکھا ہے اللہ

کے لیے اس سے جو وہ پیدا کرتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقرر حصہ۔

اسی طرح: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ (المائدہ ۵:۱۰۳)

نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔ وغیرہ آیات میں عربوں کی رسوم کا ذکر ہے۔ اگر یہ رسوم ہمیں معلوم ہوں تو آیات کا مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے اور اگر نہ معلوم ہو سکیں تب بھی آیات کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔

۳۔ بے شمار آیات جن کا تعلق عقائد، عبادات، تاریخی واقعات، موت اور مابعد الموت کے حالات سے ہے، ان کا کوئی متعین سبب نزول نہیں ہوتا۔ ان کا پس منظر بیان کرنا محض تکلف ہے۔ معاشرے کے عمومی حالات ہی ان آیات کے نزول کے متقاضی ہوتے ہیں۔

اسباب نزول کے سلسلے میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ جو آیات تاریخی پس منظر کے ساتھ وابستہ ہیں، کیا ان میں عموم الفاظ کا اعتبار ہو گا یا خصوصی موارد کا۔ اس سلسلے میں تمام صحابہ اور امت مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہو گا بلکہ عموم اطلاق کا اعتبار ہو گا۔ یعنی قرآن حکیم اگر عرب کے معبودان باطل اور ان کے معاشرے میں رائج مشرکانہ رسوم کی تردید کرتا ہے تو اس سے شرک کی تردید عام مراد ہو گی۔ اس کا مظہر خواہ کچھ بھی ہو کیونکہ خصوصی سبب عموم اطلاق کو مانع نہیں ہے۔ (جاری)

نیک خواہشات کے ساتھ

منجانب

TATA TEXTILE MILLS LTD. Ph. (...) 242-6761 (3 LINES)
ISLAND TEXTILE MILLS LTD. (DIR) 2426202, Fax: 2417710
SALFI TEXTILE MILLS LTD. LANDHI : 7738228, Fax: 7738637,
TATA ENERGY LTD. KOTRI : 870932, 870979,
8,8TH FLOOR, TEXTILE PLAZA, 870237, Fax: 870260
M.A. JINNAH ROAD, MUZAFFAR GARH : 32062, Fax: 32662
KARACHI - 74000 Mobile : 0342 - 335814
PAKISTAN. Home : (KAR) 4542090 - 4547515

افراط آبادی ـــــ نعمت یا آفت؟

پیٹر بائیور
ترجمہ: سجاد احمد ثاقب

افراط آبادی' ایک نعمت ہے یا آفت؟ افراط آبادی کا مطلب شرح اموات اور شرح پیدائش کے درمیان عدم مطابقت ہے۔ شرح اموات میں کمی کا مطلب مدت حیات میں اضافہ ہے۔ لہٰذا آبادی میں اضافے کو موت پر زندگی کی فتح کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر آبادی میں اضافہ ایک نعمت ہے نہ کہ آفت۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہوئے دیکھنا پسند کرتی ہے۔

لاکھوں کی رقم اور سیاست دانوں اور ماہرین کے قیمتی اوقات کار میں سے ہزاروں گھنٹے اقوام متحدہ کی ایسی کانفرنسوں پر خرچ ہو جاتے ہیں جن کی بنیادی وجہ غلط ترین مفروضوں میں سے ایک ہے ــــ یعنی دنیا کی آبادی کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ عالمی برادری آبادی میں اس اضافے کو مکمل تباہی' تیسری دنیا کے ممالک کی مشکلات کی سب سے بڑی وجہ اور انسانی ماحول اور انسانی زندگی کے لیے ایک خطرہ سمجھتی ہے۔ اسے ایک بدیہی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تیسری دنیا کی غربت کی وجہ آبادی کا دباؤ نہیں ہے۔ معاشی استحکام اور ترقی کا انحصار لوگوں کی تعداد کی بجائے ان کی محنت پر ہوتا ہے۔ اصل فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ بچوں کی تعداد کا تعین بچوں کے والدین کو کرنا چاہیے یا یہ حق حکومت کے اہلکاروں کو تفویض کر دیا جائے۔ افراط آبادی کے خطرے کی دہائی دینے والے افراد میں سے ایک نہایت اہم فرد امریکہ کے سابق سیکرٹری دفاع اور ورلڈ بنک کے سابق سربراہ' رابرٹ میکنامارا ہیں جنھوں نے اس بات کو مختصر الفاظ میں یوں پیش کیا ہے: ''تیسری دنیا کے عوام کی معاشی اور سماجی ترقی میں سب سے بڑی اور واحد رکاوٹ آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہے۔ آبادی میں اس بے تحاشا اضافے سے پیدا ہونے والا خطرہ ایک نیوکلیئر وار کے خطرے سے کسی طور بھی کم نہیں ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اندیشے بالکل بے بنیاد ہیں۔